فلسفۂ صبر

رہبر معظم سید علی خامنہ ای حفظہ اللہ

معراج کمپنی

بیسمنٹ میاں مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

نام کتاب:	فلسفۂ صبر
مؤلف:	رہبر معظم سید علی خامنہ ای
کمپوزنگ:	انس کمیونیکیشن **0300-4271066**
ناشر:	معراج کمپنی لاہور
زیرِ اہتمام:	ابوظہیر

ملنے کا پتہ

محمد علی بک ایجنسی اسلام آباد

0333-5234311

عَرضِ ناشر

ہم نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ آپ کی خدمت میں بہترین کتب پیش کریں اور اپنے بزرگوں کی کاوشوں کو آپ کے لئے شائع کریں، اسی سلسلہ میں اس سے قبل جناب سید العلماء سید علی نقی نقوی نقن رحمۃ اللہ علیہ کی کتب شائع کی ہیں اور وہ سلسلہ بھی جاری ہے اور اس کے ساتھ آپ کی دعاؤں اور اللہ کی رحمت اور توفقیات سے اب جناب رہبر معظم سید علی خامنہ ای مدظلہ کی کتب کا سلسلہ اشاعت کا آغاز کیا جا رہا ہے۔

اگر اللہ نے توفیق دی تو انشاء اللہ ہم جناب رہبر معظم کی تمام کتب جو دستیاب ہوں گی ان کو مرحلہ وار شائع کریں گے۔ اس سلسلہ میں آپ حضرات سے گزارش ہے کہ اگر آپ کے پاس رہبر معظم کی کوئی کتاب ہو تو ادارہ کو ارسال کر کے ممنون فرمائیں۔

جب آپ اپنے لئے دعا کریں تو ہمیں اپنی دعاؤں میں شریک رکھیں تا کہ یہ سلسلہ جاری رہ سکے، اگر کتاب میں کوئی غلطی نظر آئے تو یہ سوچ کر معاف فرما دیں کہ انسان کی سب کوششوں کے باوجود غلطی کی گنجائش بہر حال رہ جاتی ہے، اس غلطی سے ادارہ کو آگاہ کریں تا کہ آئندہ اس کو درست کر لیا جائے۔

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف
اقبالؒ

انتساب

شہدائے کربلا کے نام
کہ جو پیکر
صبر وثبات، تسلیم ورضا تھے
اوران راہیان کربلا کے نام
کہ جنہوں نے ہر عہد میں اپنے
لہو سے اس چراغ کو روشن ومنور رکھا
مجاہدین حزب اللہ وحماس
کہ جو تحریک آزادی قدس کا
ہراول دستہ ہیں۔

ارض فلسطین سے مسلمان کا عہد نامہ

قبلہ اول کی قسم!
وادی مقدس طوبیٰ کی قسم!
سرزمین وحی کی قسم!
زمین وآسمان کے نقطہ ء انتصال کی قسم!
مسجد اقصیٰ کی قسم!
اس زمین کی قسم جہاں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معراج کے سفر میں
پہلی بار رکے
بشارت کی مبارک مٹی کی قسم!
نوجوانوں کے زخموں اور ماں باپ کے دل کے داغوں کی قسم!
اپنی زمین سے آوارہ وطن کے جانے والوں کی قسم!
روح اللہ موسوی خمینی کی قسم!
خامنہ ای مقتدیٰ ورہبر کی قسم!
دشمن کے شکنجوں میں گرفتار فلسطینیوں کی فریاد!
اللہ اکبر کی قسم اسرائیل جغرافیہ کے نقشے سے مٹ جائے گا!
ارض فلسطین اگر ہم مسلمان ہیں
تو تیرے بغیر زندگی موت ہے

ارض فلسطین اگر ہم غیرت مند ہیں

تو امریکہ کے ساتھ ساز باز باعث ننگ ہے

اگر ہم آزاد ہیں تو اسرائیل کے ساتھ مذاکرات ذلت ہیں

ارض فلسطین اگر ہم ذرہ بھر بھی شرف کے حامل ہیں

تو تجھے تنہا چھوڑنا خیانت ہے

ارض فلسطین اگر ہم امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں

تو خاموشی اختیار کرنا رسوائی ہے

حرفِ آغاز

عصر حاضر میں دنیا ایک گلوبل ویلج میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی، میڈیا اور ذرائع آمدورفت کی جدت نے بلاشبہ دنیا میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔ دنیا جو کہ سات براعظموں میں تقسیم ہے اور اسرار کائنات میں سے ایک سرِ ہے۔ اس روئے زمین پر بسنے والے پانچ ارب سے زائد بنی نوع انسان شاید تاریخ میں کبھی بھی آپس میں اتنے قریب اور ایک دوسرے کے حالات سے اتنے باخبر نہیں ہوئے جتنے کہ اس دورِ جدید میں ہیں۔ کوئی بھی شخص خاندان یا ملت مادی ترقی کی اس شاہراہ پر آنکھیں بند کر کے خود کو اپنے اہل وعیال کو، اپنے گردونواح کو محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ بلکہ ضروری ہے کہ پورے شعور، بیداری اور آگہی کے ساتھ نئے چیلنجز کا مقابلہ کیا جائے۔ انسان افکار ونظریات کے اسلحہ کے ساتھ خود کو مسلح کرے وہ افکار ونظریات کہ جن کا منبع و سرچشمہ قرآن وسیرت اہل بیتؑ ہیں۔ وہ افکار ونظریات کہ جو ہر عہد کی ضروریات، ہر دور کے تقاضوں اور ہر ملت کی فکری وروحانی بھوک وافلاس کو پورا کرتے ہیں۔

گذشتہ وموجودہ صدی اس حوالے سے ایک ممتاز ومنفرد مقام کی حامل ہیں کہ ایک بار پھر بنی نوع انسان نے اس روئے زمین پر قرآن وعترت کے احکام وفرامین کے عملی نفاذ کا مشاہدہ خود اپنی آنکھوں سے کیا اور دورِ جدید کے بتوں، امریکہ، اسرائیل اور روس کی شکست وریخت کا خود نظارہ کیا۔ ہمارا اشارہ یقیناً انقلابِ اسلامی ایران اور امام خمینیؒ کی الٰہی ونورانی رہبریت کی جانب ہے۔ وہ انقلاب اور قائد انقلاب خدا کی جانب سے اپنے بندوں کے لئے ابر رحمت اور آیت الٰہی تھے اور ہیں۔ خلق خدا پر اہتمام

حجت ہو چکا۔ بقول قائد انقلاب'' آج خاموشی اختیار کرنا نظام جبار کے ساتھ تعاون ہے''۔ اسی الٰہی ہدایت کی روشنی میں ہم نے بھی اپنی طرف سے سعی وکوشش کا آغاز کیا ہے۔ ہماری کوشش ہوگی کہ صحیح اسلامی افکار ومعارف کوعوام الناس تک سلیس وسادہ انداز میں پہنچایا جائے۔ ہم اپنی کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوئے اس کا جواب آپ قارئین ہمیں اپنی آراء ونظریات کے ذریعے سے بتائیں گے۔

خداوند! ہماری اس سعی وکوشش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے۔ ہمیں اس راہ میں اخلاص عطا فرمائے۔ قائد انقلاب اسلامی رہبر معظم سید علی خامنہ ای ومجاہد اسلام سید حسن نصر اللہ ومجاہدین حزب اللہ وحماس کو فتح ونصرت عطا فرمائے۔ روح امام راحل کو ہم سے راضی وخوشنود فرمائے۔

آخر میں ہم شہید راہِ کربلا شہید محمد باقر الصدر کا قول نقل کر رہے ہیں کہ جو شاید ہم جیسے بصیرت وبصارت سے محروم افراد کے لئے بینائی وروشنی کی کرن بن سکے۔ شہید الصدر فرماتے ہیں کہ تم امام خمینیؒ کی ذات میں اس طرح جذب ہو جاؤ کہ جیسے وہ اسلام میں جذب ہو چکے ہیں۔

صبر

صبر۔ اسلامی لغت کا مشہور ترین لفظ:

اسلامی متون میں مختلف مناسبتوں اور موقعوں پر اس لفظ کا استعمال ہوا ہے۔ کبھی لہجہ شوق دلانے کا رہا ہے، کبھی صلہ دینے کا، کبھی تعریف کرنے کا اور کبھی اس کی اہمیت بیان کرنے کا۔ ظاہر ہے اس سے ہر مسلمان میں امنگ پیدا ہوتی ہے کہ وہ لفظ صبر کا مفہوم سمجھے اور جہاں تک ممکن ہو وہ اس صفت کا حامل ہو۔

اسلامی الفاظ میں تحریف کی آفت نے اس لفظ کو بھی نہیں بخشا اور کہا جا سکتا ہے کہ اس کے مفاد و مفہوم کو کسی حد تک مسخ اور تبدیل کر دیا گیا ہے۔

صبر کا عمومی مفہوم

عام طور پر صبر کا مفہوم ناگوار امر کو برداشت کرنا سمجھا جاتا ہے۔

یہ مفہوم اس صورت میں بھی ابہام سے خالی نہیں اور اس میں تضاد پایا جاتا ہے لہٰذا وضاحت طلب ہے۔ جب ایک مظلوم، بے بس اور غلام معاشرے کے انحطاط کا جائزہ لیا جاتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ ستم گروں اور مفسدوں کے لئے ظلم کا سب سے بڑا وسیلہ اور پسماندگی اور انحطاط کا سب سے عظیم اور حوصلہ افزاء سبب یہی ''صبر'' رہا ہے۔

ایک غریب اور پسماندہ قوم جو ہر طرح کی بے سروسامانی اور پریشانی کا شکار ہے، یا مظلوم لوگ جن پر ہزاروں ظلم ڈھائے جاتے ہیں۔ یا ایک معاشرہ جو بد اخلاقی اور انسانی خصوصیات کے قحط سے دوچار ہے یا مجموعی طور پر ہر فرد یا معاشرہ جو بدبختی کے

گرداب میں پھنسے ہوئے ہیں، سے کہا جائے کہ صبر کروتو اس نصیحت کا پہلا نتیجہ یہ اخذ کیا جائے گا کہ درپیش حالات کا مہلک اور تلخ جام انہیں گوارا کرنا ہے اور نہ صرف وہ اپنی موجودہ حالت سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے بلکہ اس بے انصافی اور سرد مہری کے لئے جو مبہم اجر مقرر کیا گیا ہے اس کی یاد دہانی پر اپنے حالات پر خوش رہتے ہوئے اسے (اجر کو) اپنے لئے عظیم نعمت سمجھیں۔

صاف ظاہر ہے کہ ایسے معاشرے میں ایسا احساس پھیلانا مفاد پرست طبقے کے لئے کس قدر مفید اور مظلوم طبقے کے لئے کس قدر نقصان دہ ہے۔

افسوس کہ صبر کا یہی مفہوم اپنے غلط نتائج سمیت موجودہ مسلمان معاشرے میں ایک حقیقی اور ناقابل تغیر مفہوم سمجھا جاتا ہے۔ اس لفظ کی کوئی دوسری تشریح جدید ذہنوں کے لئے بے شک قابل قبول اور منطقی بھی ہو لیکن ہمارے زمانے کے کج فکر جدید تشریح پر دلائل مانگتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس تشریح کا کوئی مثبت فائدہ نہیں ہوتا۔

جب ہم صبر سے متعلق آیات و روایات کا وسیع مطالعہ کرتے ہیں تو اس لفظ کے مفہوم میں کی گئی تحریف پر حیرت وافسوس بڑھ جاتا ہے۔

صبر سے متعلق روایات کا مجموعی جائزہ:

آیات قرآنی اور روایاتِ آئمہ میں صبر کی جو واضح اور صریح تشریح کی گئی ہے، جب ہم اس کا جائزہ لیتے ہیں تو نتیجہ صبر کے اس عام مفہوم کے برعکس نکلتا ہے جو عوام الناس میں رائج ہے۔

ان روایات کی روشنی میں صبر ایک ایسی قوت میں تبدیل ہو جاتا ہے جو بڑی سے بڑی مشکلات کو بھی بڑے آرام اور سو فیصد مثبت نتائج حاصل کر کے دور کر دیتا ہے اور ایک سیاہ بخت معاشرے میں خوشحالی اور خوش قسمتی کی کلید سمجھا جاتا ہے اور دوسری طرف شرانگیز اور تباہ کن طاقتوں کی مزاحمت کرتا ہے۔

صبر کا مفہوم اور دائرہ کار سمجھنے کے لئے واحد نتیجہ خیز راستہ یہی ہے کہ قرآن و

سنت کی طرف رجوع کیا جائے اور نہایت غور اور احتیاط کے ساتھ تحقیق کے بعد صحیح فیصلہ صادر کیا جائے۔

قرآن کریم میں ستر (۷۰) سے زائد بار ''صبر'' اور ''صبر کرنے والوں'' کا ذکر ہوا اور اس صفت اور اس کے حامل افراد کی تعریف کی گئی ہے۔ اس صفت کے نتائج اور اس خصلت کے حوالے سے جن مواقع پر (خیر کی) توقع رکھی جا سکتی ہے، انہیں بیان کیا گیا ہے۔

لیکن ہم اس مختصر بحث میں صبر سے متعلق قرآنی آیات کو پیش کرنے کی بجائے روایات سے اخذ و استنباط پر اکتفا کریں گے۔ کیونکہ

۱۔ آیات پر غور وفکر لمبی بحث کا متقاضی ہے اور اس طویل بحث کے لئے کافی وقت کی ضرورت ہے۔

۲۔ روایات پیش کرنے سے ایک فائدہ یہ ہوگا کہ حالیہ تحققات میں احادیث معصومینؑ کے جس کردار سے صرف نظر کیا جاتا رہا ہے اور یہ خلا بطور محسوس موجود ہے [۱] وہ پر ہو جائے گا۔ دوسری طرف ان لوگوں کے سامنے شیعی روایات سے اخذ و استنباط کی کیفیت بھی سامنے آجائے گی جو حدیث کے واضح کردار سے بے خبر ہیں۔

صبر کا مختصر مفہوم

روایات کے مجموعی طور پر مطالعہ کے بعد صبر کی یوں تعریف کی جا سکتی ہے ''شر انگیز، مفسد اور انحطاط آفرین محرکات کے سامنے تکمیل کا راستہ طے کرنے میں آدمی کی ثابت قدمی صبر کہلاتی ہے''۔

---

[۱] بالکل ویسے ہی کہ بعض لوگوں نے اسلام کے اصول وفروغ کی شناخت میں قرآن کے کردار کو مکمل طور پر یا بہت زیادہ حد تک فراموش کر دیا لیکن حدیث کو خواہ وہ ضعیف اور کمزور ہو۔ دین کی شناخت کا واحد معیار سمجھتے تھے اور اب بھی سمجھتے ہیں۔ یعنی وہی انتہا پسندی جو جدید حالت (حدیث سے انتہا پسندی کی حد تک بے اعتنائی) میں پائی جاتی ہے۔

مثال کے طور پر ایک کوہ پیما کے عمل پر غور کریں۔ اسے بلند پہاڑ کی چوٹی تک پہنچنے کے لئے رکاوٹوں کا سامنا ہے۔ یہ رکاوٹیں چاہے اس کے وجود سے تعلق رکھتی ہوں، چاہے باہر کی دنیا سے بہرحال اس کے سفر کی مزاحمت کرتی ہیں۔ داخلی رکاوٹیں یعنی آرام پسندی، ڈر، ناامیدی اور مختلف خواہشات اسے سفر سے باز رکھتی ہیں اور وسوسوں کی شکل میں اس کا اوپر جانے کا جذبہ مار ڈالتی ہیں بیرونی رکاوٹیں پتھر، چٹانیں، درندے، ڈاکو اور کانٹے وغیرہ ہیں جو اس کا قدم روکتی ہیں۔

جو شخص اس قسم کی مزاحمتوں سے دوچار ہے، ان کا مقابلہ کرنا، ہر رکاوٹ کو ارادے اور عزم کے ساتھ دور کرنا اور اپنا کام جاری رکھنا ''صبر'' کہلاتا ہے۔

انسان اس دنیا میں اپنی محدود زندگی اور پیدائش اور موت کے درمیانی فاصلے میں درحقیقت ایک منزل کا راہی ہے اور وہ اس منزل تک جلد از جلد پہنچنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

انسان پر جو ذمہ داریاں عائد کی گئی ہیں، وہ دراصل اسے مذکورہ ہدف تک پہنچانے کے وسائل ہیں۔ خدا کے ادیان اور جلیل القدر انبیاء کا اولین مقصد اسلامی معاشرے کی تاسیس و تعمیر ہے۔ اور یہ معاشرہ اس منزل تک پہنچنے کے لئے موزوں فضا ہے۔

دوسرے الفاظ میں وہ مقصد انسان کی تعمیر و ترقی ہے۔ یعنی اس کے وجود میں صلاحیتوں کے چشمے پھوٹنا اور حیوانی خصوصیات سے زیادہ سے زیادہ چھٹکارا حاصل کرنا اور انسانی والٰہی صفات کو بڑھانا۔ یہ وہی صفات ہیں۔

جنہیں مذہبی کتب میں ''اخلاق الٰہی سے متصف ہونا'' اور ''قرب الی اللہ'' کہا گیا ہے۔

اس راستے میں کئی مشکلات ہیں، کئی رکاوٹیں ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک رکاوٹ بھی کمال کی چوٹی کا راستہ روکنے کے لئے کافی ہے۔

اندر سے بری صفتیں اور باہر سے دنیاوی بے سروسامانیاں راستے کی رکاوٹ بنتی ہیں۔صبر یعنی ایسی تمام رکاوٹوں کا مقابلہ کرنا اور عزم و ہمت کے ساتھ راستہ طے کرنا۔

جیسا کہ ہم نے کہا ہے سب شرعی فرائض کیا اجتماعی اور کیا انفرادی اس مقصد تک پہنچنے کے لئے وسیلہ ہیں۔ لہٰذا ہر وسیلہ کسی نہ کسی طرح اپنے مقصد کے نزدیک تر ہے۔

جیسے کوئی شخص دور دراز شہر کا سفر کرتا ہے اور راستے میں جنگل و بیابان سے گزرتا ہے۔ ہر منزل اور ہر آبادی تک پہنچنے کے لئے چلنے سے پہلے سامانِ سفر لیتا ہے یہی قریب تر مقصد ہے۔ البتہ ایسا مقصد جو اس آخری منزل تک پہنچنے کا مقصد ہے۔ بلکہ اس راستے پر اٹھایا گیا ہر قدم اگر چہ فی نفسہ منزل کے حصول کا ذریعہ ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ آخری مقصد کا ابتدائی نتیجہ اور قریبی ہدف سمجھا جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ کسی بھی مقصد تک رسائی کے لئے بنیادی شرط صبر کا ہونا اور مشکلات کو دور کرنے والے اس ہتھیار (صبر) کا استعمال ضروری ہے۔

جس طرح پہاڑ کی چوٹی تک پہنچنے کے راستے میں کئی مشکلات ہیں۔ اسی طرح ہر اسلامی فریضہ کے راستے میں، جو خود قریبی مقاصد اور آخری مقصد تک پہنچنے کا ذریعہ ہیں۔ بے شمار داخلی اور خارجی رکاوٹیں موجود ہیں۔ ایک طرف تنزلی کی طرف لے جانے والی اندرونی محرکات ہیں مثلاً سستی،، سہل انگاری، بے انصافی، خود پرستی، تکبر، غرور، حرص، آرام پسندی، خواہش اقتدار، شہرت طلبی، جنسی خواہشات، ہوس زر اور ایسی بیسیوں بری خصلتیں اور دوسری طرف وہ جبری نامساعد حالات ہیں جو اجتماعی نظاموں کی بدولت بنی نوع انسان پر مسلط ہیں۔ ان میں سے ہر حالت کسی نہ کسی طرح انسان کو تعمیری فرائض کی بجا آوری سے روکتی ہے۔ خواہ وہ انفرادی مثلاً عبادت ہو، خواہ اجتماعی فرض مثلاً اعلائے کلمۃ الحق کے لئے کوشش۔

جو چیز ہر کام کے انجام دینے اور ہر نتیجے تک پہنچنے کی ضمانت دے سکتی ہے۔ وہ

آدمی کی مشکلات کے سامنے ثابت قدمی ہے یعنی صبر۔

روایات کی روشنی میں صبر کی اہمیت:

صبر کے بارے میں جو احادیث موجود ہیں وہ تمام آسمانی مذاہب منجملہ اسلام میں صبر کی اہمیت کی ترجمان ہیں۔ایک حدیث میں یوں آیا ہے:

''تمام پیغمبران اور راہ رواں حقیقت نے اپنے جانشینوں اور پیروکاروں کو صبر کی تلقین کی''۔

آپ ایک مہربان باپ، ایک حساس استاد جس نے ساری عمر مقصد کی خاطر عمل وکوشش میں گزار دی، کو مدنظر رکھیں جب وہ جان، جانِ آفرین کے حوالے کرنے لگتا ہے اور ان تمام کوششوں سے ہمیشہ کے لئے دست بردار ہو جاتا ہے۔جنہوں نے اس کی زندگی کو سروسامان بخشا ہوتا ہے لیکن اس لمحے تک بھی وہ مقصد سے وابستہ رہتا ہے وہ اپنے مقصد کا تعاقب کرتا ہے۔نزع کے عالم میں وہ ایسے شخص کو کیا وصیت کر سکتا ہے جو اس کا مشن جاری رکھے اور بوجھ کو اٹھا کر منزل کے قریب تر جا سکے۔

وہ اس وصیت میں اپنے تمام علمی اور عملی تجربات بھر کر رکھ دیتا ہے۔اس آخری وقت میں اگر کچھ بیان کر سکتا ہے تو ایک مختصر جملے میں سمیٹ دیتا ہے۔ وہ اپنے تمام تجربات اور مشاہدات کو ایک مفید وصیت کی شکل میں ایک کیپسول میں بند کر کے اپنے شاگرد یا وارث کے حوالے کر دیتا ہے۔حقیقت میں وہ اپنی زندگی جس موڑ پر ختم کرتا ہے وہاں سے وہ اپنے بعد آنے والے شخص کے لئے نقطہ آغاز مہیا کرتا ہے۔

اب آپ مندرجہ ذیل دو حدیثوں پر توجہ فرمائیے۔

پہلی حدیث:۔

ابوحمزہ ثمالی جو کہ خانوادہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاص اور مخلص پیروکار ہیں۔اپنے استاد اور امام باقرؑ سے نقل کرتے ہیں، جب میرے باپ علی بن حسین علیہ السلام کی وفات

کا وقت نزدیک آیا تو مجھے اپنے سینے سے چمٹا کر کہا میرے بیٹے! میں تجھے وصیت کرنا چاہتا ہوں وہ وصیت جو میرے والد نے اپنے آخری وقت میں مجھے کی تھی۔

حسین ابن علی کے آخرلمحات کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ کربلا کی خونی فضا میں خیمہ زن ہو کر جس مصیبت میں وہ مبتلا تھے اور دشمن کے گھیرے میں تھے۔ اس وقت بھی وہ دشمن پر حملہ کرنے سے پہلے اپنے خیموں کی طرف آئے اور اہل خاندان جنہوں نے اپنے اپنے حصے کے مطابق ان کی تحریک جاری رکھنی تھی، مختصر ملاقات کی۔ اپنے بیٹے اور جانشین علی بن حسینؑ سے گوتھوڑی دیر ہی گفتگو کی۔ لیکن وہ بات چیت بے حد اہم ہے۔

آپ اس گفتگو کو عرف عام میں خدا حافظی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن جاننا چاہیے کہ امام جذبات سے اس قدر مغلوب نہیں تھے کہ زندگی کی اس آخری مہلت میں اہم ترین وصیت کے علاوہ کوئی دوسری بات کرتے یا اپنے ذاتی یا جذباتی مسائل چھیڑ دیتے۔ دوسرے آئمہ بزرگوار کے جو وصایا ہم تک پہنچے ہیں وہ بھی اس حقیقت کی تائید کرتے ہیں۔

حضرت حسینؑ کو اس حساس وقت میں احساس تھا کہ وہ بار امانت جو انہوں نے امامت کے زمانے کے شروع میں اپنے کندھے پر اٹھایا تھا اور ساری عمر اس مقصد کو پورا کرنے میں کوشاں رہے اور ان سے پہلے اسلامی انقلاب کے بانی یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امیر المومنین اور امام حسن علیہ السلام بھی اسی مقصد کے حصول کے لئے کوشش کرتے رہے اور اس کی خاطر ہر مصیبت کا سامنا کیا۔ وہ بار اب دوسرے شخص کو منتقل کرنا ہے اور اپنے جانشین کی ہمت بندھانا ہے۔ لہٰذا وہ میدانِ جنگ سے ایک اہم وصیت کرنے آئے تھے۔ وہ اہم وصیت کیا تھی۔

اب علی بن حسین علیہ السلام بھی کم وبیش اسی کیفیت سے دوچار ہیں جو ان کے والد حسین بن علی کو تھی۔ وہ اپنے بیٹے اور جانشین امام باقرؑ کے سامنے وہ راز فاش کرتے ہیں اور وہی وصیت دہراتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بالکل یہی وصیت حسین ابن علی علیہ السلام نے بھی

اپنے والد امیر المومنین سے سنی تھی اور اسے چھپایا نہیں تھا۔

پس یہ وہ وصیت ہے جس کا سلسلہ زمانہ امامت یعنی امیر المومنین علی علیہ السلام سے شروع ہوتا ہے اور سینہ بہ سینہ ایک امام سے دوسرے امام تک پہنچی ہے۔ یہ وصیت کیا ہے، اس کا حاصل ''صبر'' ہے۔

''میرے بیٹے حق پر قائم رہنا اور صبر کرنا۔ خواہ وہ تلخ اور ناگوار ہی ہو''۔

یعنی راہِ حق میں رکاوٹوں سے نہ ڈرنا، متردد نہ ہونا، جب یہ پتہ چل گیا کہ یہ راہِ حق ہے تو پھر اس پر گامزن ہو جانا چاہئے اس راہ میں مشکلات، ناکامیاں اور تلخیاں ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ سب برداشت کرنا، سب پر صبر کرنا اور اپنا سفر جاری رکھنا۔ ظاہر ہے حق و باطل کے معرکے میں عیش و آرام اور لطف و لذت میسر نہیں بلکہ محنت و مشقت سے واسطہ پڑتا ہے۔ اس محنت و مشقت پر صبر کرنا اور تلخیاں پیدا کرنے والے حق پر ثابت قدم رہنا۔

یہ وصیت ہے جو امیر المومنین نے حسین بن علی کو کی اور حسین بن علی نے علی بن حسین کو، اور انہوں نے امام محمد باقرؑ کو۔ ہم نے دیکھا کہ خود امیر المومنین اور دوسرے تمام راست باز آئمہ نے اس پر عمل کیا اور زندگی کے آخری لمحے تک حق پر قائم رہے اور اس مشکل صبر کے تمام نتائج و ثمرات کو دل و جان سے قبول کیا۔ ان پر یہ عربی شعر کس قدر صادق آتا ہے۔

صابر حتیٰ یعلم الصبر اننی
صبرت علی شئی امر من الصبر

(میں اتنا صبر کروں کہ صبر کو بھی یہ اعتراف کرنے پر مجبور کر دوں کہ میں نے صبر سے تلخ تر چیز پر صبر کیا ہے)۔

پس صبر کی اہمیت جاننے کے لئے یہی کافی ہے کہ آئمہ نے اپنی زندگی کے آخری لمحے میں اپنے جانشین کو جو متاع گراں دی وہ صبر کی تلقین تھی۔

فقہ الرضا امام علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام سے منسوب کتاب ہے۔ اس کتاب میں اسلام کے بعض حقوق کا ذکر ہوا ہے۔ یعنی وہ چیز جسے اصطلاح میں فقہ کہتے ہیں۔ البتہ قرآن اور حدیث کی اصطلاح میں اس لفظ کا مفہوم بہت محدود تر ہے۔ اس کتاب کا ایک حصہ اسلامی معارف اور مقاصد وسائل کی شناخت کے بارے میں ہے یعنی وہی چیزیں جو فقہ کا وسیع مفہوم متعین کرتی ہیں۔ مثلاً یہ پر معنی حدیث

''ونروی'' ہم روایت کرتے ہیں یعنی یہ بات ہمارے خاندان کی میراث اور یادگار ہے۔ ہم نے اسے اپنے اجداد واسلاف سے سنا ہے۔ ہمیشہ ہم سے کہا گیا ہے اور ہم نے اسے آگے چلایا ہے کہ

''خدا کے انبیاء ان کے وارثین نے اپنے شاگردوں کو اپنی تمام وصیتوں میں یہ دعوت و درس دیا''

''حق پر قائم رہیں خواہ وہ تلخ اور ناگوار ہو''

یہ بالکل وہی جملہ ہے جو پہلے آئمہ سے بے کم و کاست نقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ شاید صبر کی اہمیت واضح کرنے کے لئے مختصر ترین اور پر مغز ترین یہی جملہ ہے۔ جو آئمہ و انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے نقل ہوئے۔

پس ان دو حدیثوں کے پیش نظر ہم صبر کی اہمیت واضح کرنے کے لئے اس کی تعریف یوں کر سکتے ہیں ''صبر یعنی انبیاء و اولیاء کی اپنے وارثوں اور جانشینوں کو وصیت''۔

دین میں صبر کے مقام سے کیا مراد ہے؟

دین اخلاق اور قانون کے معارف اور ضوابط کا مجموعہ ہوتا ہے۔ بالکل ہر اس مکتب کی طرح جو معاشرے کی تعمیر کرتا ہے اور اس کے مندرجہ ذیل ارکان ہوتے ہیں۔

۱۔ نظریہ کائنات یعنی وہ مکتب کس بنیاد پر دنیا اور انسان کے بارے میں سوچتا ہے۔

۲۔ آئیڈیالوجی یعنی اس اصول کی بنا پر انسان کے عمل کی

پالیسی کیا ہے؟

۳۔ ان دونوں اصولوں کی بنیاد پر ایسے ضروری اور حتمی قوانین پیش کرنا جو انسان کے خدا، اپنی ذات، دوسرے انسانوں اور غیر انسانی موجودات کے ساتھ تعلق کو متعین کریں۔

۴۔ حقیقی تکمیل کے راستے میں ضروری اور معقول کوششوں کو تیز تر کرنے اور زندگی کے میدانوں میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے کام کرنا اور اخلاقی قوانین اور تعلیمات کو پیش کرنا۔

البتہ اس مجموعہ قوانین میں انفرادی مسائل (یعنی جن کا تعلق انفرادی اور ذاتی مصلحت سے ہے) بھی ہیں اور اجتماعی مسائل بھی (یعنی جن مسائل کا تعلق عظیم گروہوں بڑے بڑے انسانی طبقوں اور مسلمان اجتماع سے ہے)۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ اس مجموعہ قوانین میں صبر کا کیا اثر اور کردار ہے یا دوسرے لفظوں میں دین سے وابستہ ایک انسان، ایک مومن کو کسی اصول کا معتقد ہونا چاہئے اور اس میں اخلاقی اور روحانی خصوصیات موجود ہوں۔

ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ایمان میں صبر کا کیا کردار ہے اور ایسا (صابر) شخص اپنی دینداری اور مسلمانی میں کیسا ہے؟

جیومیٹری کی ایک ہندسی شکل جس کے اضلاع اور زاویے ہوتے ہیں۔ اس کا ہر خط، ہر کونہ، ہر قوس، ہر نیم دائرہ اپنی جگہ پر ایک مفہوم اور اثر رکھتا ہے۔ پس ایک فرد کے ایمان کی ہندسی شکل میں یا دین کے کلی نقشے میں صبر کا کیا اثر اور مقام ہے؟

مثال کے طور پر آپ ایک گاڑی کو مدنظر رکھیں۔ جسے تمام اسباب سمیت مسافروں کو لے جانا ہے۔ جنگل بیابان سے گزرنا ہے اور صحیح وسلامت اپنی منزل مقصود تک پہنچانا ہے۔ اس گاڑی کو متحرک کرنے والی چیز کیا ہے؟ موٹر، جو چیز موٹر کو قوت بخشتی ہے وہ کیا ہے؟ پٹرول، صبر کو ہم تکمیل کے سفر یعنی دین کے لئے موٹر یا اس موٹر کے لئے

تیل سمجھ سکتے ہیں۔

اگر صبر نہ ہوتو دین کی حق و منطق پر مبنی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی اور اس دین کے علوم و معارف دنیا میں بہترین انسانی علوم کے طور پر سامنے نہیں آ سکتے اور نہ مومنین اور شائقین کو دین کی کامیابی کے دن کے انتظار میں ثابت قدم رکھا جا سکتا ہے اور نہ ہی دین کے وہ قوانین نافذ ہو سکتے ہیں جو انسانی خواہشات کے قطعاً موافق نہیں ہیں۔

اگر صبر نہ ہوتو خدا اور دین کی خاطر لڑی جانے والی جنگ کا میدان نظریاتی قبرستان میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ حج کا بین الاقوامی اجتماع جس میں دور دور سے بھائی جمع ہوتے ہیں، خالی رہتا ہے۔ آدمی رات کو خلوت میں پر جوش مناجات کرنے والوں کی نغمگی خاموش ہوجاتی ہے۔ نفس کے ساتھ جہاد یعنی روزہ داری اور خود انضباطی کے مناظر کی رونق ختم ہو جاتی ہے۔ اسلامی معاشرے کی معیشت کی رگ خشک ہو جاتی ہے اور انفاق فی سبیل اللہ ختم ہو جاتا ہے۔

اگر صبر نہ ہوتو اسلام کی تمام علمی اور اخلاقی قدریں تقویٰ، ایمان، صدق پس پشت ڈال دیئے جاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ دین اور انسانیت کا ہر وہ شعبہ جس میں کوشش اور عمل کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس بنیادی شرط سے محروم رہتا ہے۔

کیونکہ دین عمل سے ہے اور عمل صبر سے پس جو چیز اس عظیم مجموعہ قوانین کو توانائی مہیا کرتی ہے اور اس کاروان کو متحرک رکھتی ہے وہ صبر ہے۔

یوں ہم اس آسمانی الہام (صبر) کے معنی اور مفہوم کو جس کا ذکر آئمہ معصومین علیہم السلام کی روایات میں قدرے لفظی اختلاف کے ساتھ موجود ہے اور ہم تک پہنچا ہے سمجھ سکتے ہیں۔

''ایمان کے جسم میں صبر کی مثال انسان کے جسم میں سر کی سی ہے''۔

انسانی جسم میں سر زندگی کی قطعی ضمانت کا حامل ہے، بدن میں باقی اعضاء کے نہ ہونے کو برداشت کیا جاسکتا ہے۔ ہاتھ، پاؤں، آنکھ، کان وغیرہ لیکن سر جو کہ اعصاب کو

کنٹرول کرتا ہے اگر نہ ہو یا مفلوج ہو جائے تو جسم کے تمام اعضاء مفلوج ہو جاتے ہیں۔ممکن ہے سر کٹا انسان زندہ رہے لیکن عمل اور اثر میں مردے سے مختلف نہیں ہے۔

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جو کام دوسرا عضو انجام دیتا ہے۔ وہ بہت نمایاں ہوتا ہے اور بسا اوقات انسان کے دست بازو اور آنکھ وغیرہ کوئی نمایاں کارنامہ سرانجام دیتے ہیں۔لیکن یہ سب سر کے وجود کی برکت سے ہے۔صبر بھی ایسا ہی ہے۔

اگر صبر نہ ہو تو توحید بھی نہیں پنپ سکتی۔ نبوت اور بعثت کا بھی کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ الٰہی اور اسلامی معاشرہ تشکیل نہیں پا سکتا۔ کمزوروں کو حقوق نہیں ملتے، نماز، روزہ عبادت اور ذکر اپنی جگہ پر قائم نہیں رہ سکتے۔

یہ صبر ہے جو دین اور انسانیت کی تمام خواہشات کو عملی صورت بخشتا ہے۔ اگر ابتدائے اسلام میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی حق بات پر قائم نہ رہتے اور تمام مخالفوں کا مقابلہ نہ کرتے تو یہ بات یقینی تھی کہ اسلام کی آواز آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر کی چار دیواری سے باہر نہ نکلتی اور لا الہ الا اللہ کا نعرہ اپنے نقطہ آغاز پر ہی ختم ہو جاتا۔

جس چیز نے اسلام کو قائم رکھا وہ صبر ہے۔ اگر اولیاء اللہ اور انبیائے عظام صبر سے کام نہ لیتے تو آج توحید کا وجود نہ ہوتا۔

جس چیز نے انسان کی تخلیق کے ابتدائی دور سے لے کر آج تک رشتہ توحید اور خدا کے پیغام کو قائم رکھا وہ صبر تھا۔صبر ہی اس نظریہ کا علم بردار ہے اور قیامت تک رہے گا۔

اگر منطقی باتوں اور الفاظ نظریات کے ساتھ صبر نہ ہو تو وہ باتیں گلے میں اور زبان پر ہی خشک ہو جائیں اور تاریخ کے سمندر میں غرق ہو جائیں۔لہٰذا یہ بات مکمل طور پر قابل قبول اور قابل فہم ہے کہ

''ایمان کے جسم میں صبر کی مثال انسان کے جسم میں سر کی سی ہے''

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے اپنے خطبہ قاصعہ میں تاریخ کے کمزور لوگوں کی زندگی میں تبدیلی اور ان کی ظالموں پر فتح اور کمزوروں کے متین جذبات کی کامیابی کا

یوں تجزیہ کیا ہے۔

''جب خدا نے کمزوروں کو خدا کے ساتھ محبت کے راستے میں مصیبتوں پر صبر کرتے دیکھا اور خدا کے خوف سے ان پر جو ناگوار حادثات گزرے انہیں برداشت کرتے پایا، تو ان پر اس مصیبت کی گھٹن میں مسرت کے دروازے کھول دیئے اور کمزور لوگ قائد اور حکمران بن گئے اور ان کی عزا اور مکرمت اس اعلیٰ مقام تک پہنچ گئی کہ ان کی بلند اور پرواز خواہش بھی وہاں تک نہیں پہنچی تھی۔

تاریخ کا عمل ہے جو ابد تک ایسا ہی رہے گا۔ پس اسلام میں صبر کے مقام کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ صبر تمام دینی، انفرادی اور اجتماعی خواہشات و مقاصد کو پورا کرتا ہے۔''

اس مختصر تعریف کے بعد شر انگیز، فساد انگیز اور انحطاط انگیز محرکات کے سامنے ثابت قدم رہنا صبر ہے۔ ہم ان مقامات اور مواقع کو آسانی کے ساتھ جان سکتے ہیں۔ جہاں صبر کرنا مطلوب ہے۔

ظاہر ہے کہ ہم اس صبر کے بارے میں بات کر رہے ہیں جو اسلامی ماخذ اور متون یعنی قرآن وحدیث میں مذکور ہوا ہے اور اسی صبر پر دنیا اور آخرت کے وافر اجر کا وعدہ دیا گیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ وہ بے خبر اور اجرت پر کام کرنے والا سپاہی جو میدان جنگ میں اسلام کے خلاف حق و عدل کے علم برداروں کے سامنے ثابت قدمی کا مظاہرہ کرتا ہے اور اپنے آقا کی اطاعت کرتے ہوئے اپنی جان کھو دیتا ہے۔ یا وہ دولت مند اور صاحب منصب جو اپنی دولت اور حیثیت کی حفاظت کی خاطر دعوت کے سامنے ثابت قدم رہتا ہے یا وہ لوگ جو ہوا و ہوس کی تحریک پر حق کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ صرف لفظ اور نام کی حد تک ''صابر'' کہلا سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ ان کی ثابت قدمی انسانیت کی تکمیل کے لئے نہیں تھی بلکہ اس کے مخالف تھی اور انہوں نے اس ثابت قدمی کا مظاہرہ شر و فساد کی

بجائے انسانیت کی تکمیل کے مظاہرے کے سامنے کیا۔ لہٰذا ان پر اس صبر کا اطلاق نہیں ہوسکتا جو قرآن اور حدیث میں مذکور ہوا ہے۔

پس صبر کا حقیقی میدان ''انسان کی تکمیل'' کا میدان ہے۔ جہاں آدمی تخلیق کے اصل مقصد یعنی انسانیت کی تکمیل، خدا کا حقیقی بندہ بننے اور اپنی مخفی صلاحیتیں ظاہر کرنے کے لئے کوشش کرتا ہے، وہی صبر کا مقام ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہر اس محرک اور علت کا مقابلہ کرنا چاہئے جو صبر کا راستہ روکے اور اس کی حرکت اور کوشش کے آگے روڑے اٹکائے۔ یہ محرکات خواہ اندرونی ہوں مثلاً سستی، خود پرستی، آرام پسندی، حرص، ڈر، شہوت رانی وغیرہ، خواہ بیرونی جیسے شیطانی ترغیب، کشش لالچ، فساد انگیز احکام وقوانین، تحریک وتسلط، غیر موزوں اور غلط اجتماعی قوانین وغیرہ۔ اکثر یا ہمیشہ ہی یہ دونوں قسم کے محرکات ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں اور ہر صورت اور ہر شکل میں شیطانی مظہر ہیں۔

تکمیل کے سفر میں اس خطرناک راستے پر تکالیف اور حالات کے تناسب سے محرکات اور مزاحمتیں بھی مختلف ہیں۔ کبھی ایک ضروری کام کے لئے رکاوٹ سامنے آتی ہے اور کبھی نقصان دہ کام انجام دیتے وقت مزاحمت ہوتی ہے کبھی یہ رکاوٹ بالواسطہ بھی ہوتی ہے۔

ہم پہلے کوہ پیمائی کی مثال پیش کر چکے ہیں۔ کبھی راستے میں پتھر، کانٹا، ڈاکو یا بھیڑیا رکاوٹ بن کر سامنے آتا ہے اور کبھی خوبصورت منظر، نرم بستر اور وسوسے ڈالنے والا ہمراہی کوہ پیما کو سامان اتار کر قیام پر اکساتا ہے اور یہ اس کے راستے کی ایک دوسری قسم کی رکاوٹ ہے۔ کبھی اسے راستے میں بیماری یا کوئی اور رنج لاحق ہوجاتا ہے جس کے نتیجے میں اس کا جذبہ ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ یہ بالواسطہ رکاوٹ ہے۔

اسی قسم کی رکاوٹیں انسان کے سفر تکمیل کے دوران میں سامنے آتی ہیں۔ اگر ہم انسان کی تکمیل کے سفر میں مذہبی فرائض کو اقدامات اور وسائل سمجھ لیں اور محرکات و

منکرات کو انحرافی حرکت اور بے آرامی اور بے قراری کی صورت میں زندگی کے تلخ واقعات کو عدم استحکام اور حوصلہ شکنی کا سبب قرار دیں تو مخالف محرکات کی ہم اس طرح تقسیم کر سکتے ہیں۔

واجبات ترک کرنے کے محرکات، محرکات ومنکرات بجالانے کے محرکات، روحانی بے چینی اور عدم استحکام کے محرکات اور صبر یعنی ان تینوں محرکات کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرنا اور ثابت قدم رہنا۔ بے شک یہ تینوں عوامل فساد انگیز، شرانگیز اور انحطاط آفرین ہیں۔

پس صبر سے مراد وہ ثابت قدمی ہے۔ جس کا مظاہرہ ان محرکات کے سامنے ہوتا ہے جو انسان کو فرائض انجام دینے سے باز رکھتے ہیں یا وہ محرکات جو ممنوع اور حرام کام انجام دینے پر اکساتے ہیں یا زندگی میں تلخ واقعات سامنے آنے پر انسان کا حوصلہ پست کر دیتے ہیں۔

اس وضاحت کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امیر المومنین علیہما السلام کے اس پر مغز قول کو بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ جس میں حضرت علی علیہ السلام نے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ نقل کیا ہے۔

''صبر تین قسم کا ہے۔ ناگوار حادثے پر صبر، واجب فرائض انجام دینے پر صبر اور خدا کی نافرمانی انجام نہ دینے پر صبر''

اگر یہ تینوں باتیں کسی شخص کی زندگی میں پائی جائیں تو وہ سچ مچ دین سے وابستہ اور مومن ہے۔

ان تینوں باتوں میں یعنی جب زندگی میں کوئی تلخ اور ناگوار واقعہ پیش آتا ہے۔ جب انسان فرائض انجام دیتے ہوئے تکالیف سے دوچار ہوتا ہے اور جب کوئی ممنوع کام اپنی طرف بلاتا ہے تو صبر کرنے کا موقع آجاتا ہے اور انسانی روح کی ثابت قدمی کی نمائش کا وقت آپہنچتا ہے۔

اس اسلامی لفظ کو مکمل طور پر واضح کرنے کے لئے اب ہم ان تینوں اقسام کی تشریح کرتے ہیں۔

اطاعت پر صبر

تمام فرائض انجام دیتے وقت ایک قسم کی زحمت یا صحیح لفظوں میں یہ کہنا چاہئے کہ مثبت اور منفی کوشش کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جو آرام پسند روح کے لئے زحمت اور درد سر کا موجب ہوتی ہے۔ ذاتی فرائض سے لے کر اجتماعی فرائض تک جیسے نماز، زکوٰۃ انفاق، حج، جہاد سب انسانی خو کے لئے ناسازگار ہیں۔ جو اگر چہ ترقی کی خواہاں ہے لیکن آرام پسند ہے اور یہ صورت حال کائنات کے تمام قوانین کیا انسانی، کیا حیوانی، کیا صحیح کیا غلط سب میں یکساں پائی جاتی ہے۔

اصولی طور پر قانون اگر چہ خود انسان کے لئے ایک ناگزیر ضرورت ہے اور اسی وجہ سے وہ اسے قبول بھی کرتا ہے۔ لیکن مجموعی طور پر کبھی قانون انسان کے لئے فطری، خوشگوار اور شیریں نہیں ہوا ہے۔

دنیا کے معروف قوانین حتیٰ کہ وہ قوانین جن کے نتائج واضح ہیں اور انہیں سب جانتے ہیں اور ان کی خلاف ورزی کے نتائج سے آگاہ ہیں۔ (جیسے ٹریفک کے قوانین) ان میں سے بھی کوئی قانون اس سے مستثنیٰ نہیں۔

باوجود اس کے کہ ٹریفک کے قوانین کی خلاف ورزی سے لوگوں کی آنکھوں کے سامنے ہزاروں خونی حادثے پیش آتے ہیں۔ لیکن کبھی یہ نہیں دیکھا گیا کہ سرخ بتی پر رکنے اور قریب کے ممنوعہ راستے سے فائدہ نہ اٹھانے پر کوئی گاڑی والا چیں بہ چیں نہ ہوا ہو۔ اسی طرح آپ دوسرے قوانین پر بھی قیاس کر سکتے ہیں۔

اگر چہ دینی فرائض کی بنیاد انسانی فطرت پر رکھی گئی ہے یعنی کسی استثناء کے بغیر وہ اس کی حقیقی ضروریات اور درحقیقت اس کی تکمیل کا وسیلہ ہیں لیکن ان فرائض پر عمل کرتے وقت انسان کم وبیش دشواری اور زحمت محسوس کرتا ہے۔ مثلاً نماز کو لیجئے۔ انسان کا

اس کے لئے وقت صرف کرنا، اپنے کسی لازمی کام کو ترک کرنا، نماز کے لئے مکمل تیاری کرنا جیسے لباس اور خاص جگہ کا ہونا یہ سب نفسانی خواہش کے خلاف ہیں۔

ادھر نماز کی حالت میں خود کو نماز میں مشغول رکھنا۔ حضور قلب، فکر اور ذہن کو غیر خدا سے ہٹانا، ذہن میں آنے والے خیالات کو رد کرنا۔ روح کے دریچے کو ہر اس بیرونی فکر پر بند کرنا جو کہ نماز کے مکمل ہونے اور اس کے موثر ہونے کی بنیادی شرط ہے۔ خاصا محنت طلب کام ہے۔

روزے کو دیکھ لیں۔ کئی گھنٹے کچھ نہ کھانا پینا، بھوک پیاس برداشت کرنا، جنسی محرکات سے بے اعتنائی برتنا دشوار اور صبر آزما کام ہے۔ یعنی کھانے پینے کی چیزیں اختیار میں ہونے اور مرغوب طبع اشیاء کی لذت سے واقف ہونے کے باوجود خود پر بھوک اور پیاس طاری رکھنا اور خالی پیٹ اور خشک ہونٹوں کے ساتھ گرمیوں میں صبح سے شام کرنا قوتِ ارادی چاہتا ہے۔

حج۔۔ سفر کی صعوبت، اعزا و اقارب سے دور ہونا، ناواقف لوگوں کے درمیان رہنا مال اور وقت صرف کرنا اور وہ بھی اس صورت میں کہ اس سفر میں سیاحانہ اغواض ومقاصد کارفرمانہ ہوں اور صرف ''حج خانہ خدا'' مطلوب ہو وہ بہت مشکل کام ہے۔

امر بالمعروف نہی عن المنکر یا جہاد جس میں جان و مال کی جو بازی لگانی پڑتی ہے۔ اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔

ظاہر ہے کلمہ حق کہنا اہل باطل کی سماعت کے لئے تلخ اور ناگوار ہے۔ شمشیر بدست ظالم یا بھیڑیوں یا ایک قوم یا طبقہ یا تمام بشریت کی موجِ فتنہ کے آگے ٹھہرنا سب سے دشوار اور مشکل کام ہے۔

اسلام کے دیگر فرائض وواجبات کا بھی یہی حال ہے۔ سب میں محنت اور زحمت کی ضرورت ہے۔ حالانکہ وہ سب امور بلا استثنا انسانیت کی نجات اور خوشحالی کے لئے مفید ترین اور ضروری ترین احکام ہیں۔

بیشک جن لوگوں نے صراط مستقیم کا پتلا چلا لیا ہے اور خدا اور انسانیت کے اعلیٰ اور مقدس مقصد کے لئے ہر دشوار راستہ طے کرنے کی لذت سے آشنا ہیں، ان کے لئے یہ تمام تکالیف قابل برداشت ہیں۔

یہی نماز خدا کے ان بندوں کے لئے بہت شیریں ہے جنہوں نے ذکر خدا اور مناجات کی لذت چکھی ہے۔

نماز کے وقت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس قدر بے قرار اور مشتاق ہو جاتے کہ حضرت بلال کو فرماتے:

''بلال اذان دو اور ہمارے قلب وروح کو سکون بخشو''

وہی جہاد فی سبیل اللہ جو تن آسان اور عاقبت نااندیش لوگوں کے لئے سخت ناگوار ہے۔ وہ حضرت امیرالمومنینؑ جیسے مضبوط روح شخص کے لئے نشاط انگیز اور مقوی روح ہے۔ حضرت امیرؑ نے نہج البلاغہ کے ایک خطبے میں اپنی اس روحانی حالت کا نقشہ یوں کھینچا ہے:۔

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ میدانِ جنگ میں ہم اپنے باپوں، بیٹوں، بھائیوں اور چچوں کو مارتے تھے۔ یہ ناگوار واقعات سوا اس کے کہ احکام خداوندی کے سامنے ہمارے ایمان اور جذبہ کو تسلیم کریں اور ہم پر مصائب کو قابل برداشت بنائیں۔ ہماری روح پر کچھ اثر نہیں ڈالتے تھے۔''

لیکن بہرحال عام طور پر یہ مشکل اور زحمت پائی جاتی ہے۔ بالخصوص ان لوگوں کو یہ بہت ناگوار اور تلخ محسوس ہوتا ہے۔ جن کی روح اور قوت ارادی کمزور ہے۔

ان دشواریوں اور بالخصوص دینی مشکلات میں کیا کرنا چاہئے؟ اب جب کہ نماز ادا کرنا مشکل ہے۔ نماز میں حضور قلب اور دل کو برے خیالات سے بچانا دشوار ہے۔ روزہ، حج، انفاق، امر بالمعروف اور دیگر اجتماعی کاموں میں دشواری ہے تو کیا انہیں ترک کر دینا چاہئے؟ اور ہوس بازوں اور روح کے لئے سہولت تلاش کرنے والوں کی خواہش

پرعمل کیا جائے؟

اسلام میں اس کا جواب ہے کہ ''نہیں۔صبر کرنا چاہئے۔ طاعت پر صبر'' حالت نماز میں دل میں جو وسوسے آتے ہیں اور دل کو جاء نماز، محراب اور مسجد سے باہر لے جاتے ہیں اور دوسرے مشاغل میں مصروف کر دیتے ہیں اور نماز کی روحانیت ختم کر دیتے ہیں، ان کا مقابلہ کرنا چاہئے۔تا کہ نماز کے معنوی فوائد حاصل ہوسکیں۔

صبر کرنا چاہئے۔ رمضان کے گرم مہینے میں انسان کو کھانے پینے کی جو شدید اشتہاء ہوتی ہے، اس پر صبر کرنا چاہئے۔

صبر کرنا چاہئے میدان جنگ میں جہاں دشمن کے روبرو خطرہ سر پر منڈلا رہا ہوتا ہے اور سرخ موت آدمی کی گھات میں بیٹھی ہوتی ہے۔ ذہن میں زندگی کی لذتیں اور عزیزوں اور رشتے داروں کی یادیں دستک دینے لگتی ہیں۔آنکھوں کے سامنے محبوبوں کے چہرے مجسم ہوجاتے ہیں۔ مادی مشاغل کسی نہ کسی طرح انسان کا دامن اپنی طرف کھینچتے ہیں، قدموں کو لڑکھڑاتے اور ارادے کو کمزور کرتے ہیں۔ان سب چیزوں کے سامنے ثابت قدمی اختیار کرنی چاہئے اور ترقی اور کامیابی کے راستے کی ہر رکاوٹ کو دور کرنا چاہئے۔

صبر کرنا چاہئے۔ستم گر کی شرر بار اور بجلی کی طرح کوندتی ہوئی نظروں پر، جس کے فسق وفجور نے قوم کو پستی میں ڈالا۔جس نے ہر فرد کو اعتراض اور غصے پر اکسایا۔ اور کوئی معترض خوف زدہ نہ ہوا اور اس ثابت قدمی سے وہ ستمگر رسوا ہوکر بلندیوں سے پستیوں پر آرہا۔

صبر کرنا چاہئے۔ شیطان کا بہکاوا جو ہزار مکروفریب سے آدمی کو سخاوت اور انفاق سے روکتا ہے اور اسے ذاتی اغراض یاد دلانے، اپنے مالی مفادات بڑھانے پر اکساتا ہے اور اسے مذہبی معاشی فرائض انجام دینے سے منع کرتا ہے اور گھر کے چراغ کو مسجد کی شمع پر ترجیح دلواتا ہے۔ شیطان کے اس وسوسے کو بے اثر بنانا چاہیے اور دینی مالی

فرائض انجام دینے چاہئیں۔

ان تمام احکام پر صبر کرنا چاہئے یعنی شر انگیز اور مصلحت سوز وسوسوں اور محرکات کا مقابلہ کرنا چاہئے۔ اس طرح ہم جس حکم پر صبر کرتے ہیں وہ ایک خاص شکل اور مفہوم اختیار کر جاتا ہے۔

ایک جگہ ثابت قدمی میدان جنگ میں دشمن کے سامنے ہے اور ایک جگہ اپنے نفس کے خلاف جہاد میں۔ ایک جگہ غربت اور پریشانی کے وسوسوں کو نظر انداز کرنا ہے۔ پس ہر مقام پر صبر اور ثابت قدمی ہے اور کہیں بھی یہ نہیں کہا گیا کہ آپ واقعات کے غلام بن جائیں اور خفت اٹھائیں۔

آئمہؑ کی زندگی میں اطاعت پر صبر:۔

آئمہ کرام کی دعاؤں میں جس ایک خصلت پر اطمینان کیا گیا ہے وہ صبر ہے۔

''تم نے صبر کیا اور یہ کام تم نے خدا کے لئے خدا کا انعام پانے کے لئے کیا''

یعنی تم نے بار امانت اٹھانے کی حامی بھری اور پھر تمام تر مشکلات کے باوجود اسے منزل مقصود تک پہنچایا۔

خلق کو ہدایت کرنے کی ذمہ داری قبول کرنا اور چھپے ہوئے حقائق بیان کرنا اور ظلم وستم کے خلاف جہاد کرنا آئمہ کرامؑ کے زمانے میں بھی اتنا ہی دشوار تھا۔

یقیناً اگر امام علیہ السلام کا صبر اس مفہوم میں ہوتا کہ زمانے کے برے حالات پر غمزدہ ہوتے اور اسلام اور مسلمانوں کی حالت پر کڑھتے رہتے اور گھر بیٹھے رہتے۔ مگر برائیوں کا قلع قمع کرنے کے لئے کوئی عملی اقدام نہ کرتے اور معاشرے کا رخ قبلے کی طرف نہ موڑتے تو یہ صبر اس امام کے لئے قابل فخر نہ سمجھا جاتا۔ کیونکہ ایسا صبر ہر شخص کر سکتا ہے بلکہ کمزور اور غیر ذمہ دار لوگ زیادہ ایسا کر سکتے ہیں۔

امام علیہ السلام کے زیارت نامہ میں قابل فخر اور نمایاں بات وہی فرض کی تکمیل کے لئے ثابت قدمی ہے۔ ایسے کام کے انجام دینے پر صبر کرنا جسے کئی لوگ انجام

نہ دے سکتے ہوں۔

قرآن پر ایک نظر

قرآن میں صبر اور صابروں کے بارے میں جو بیسیوں آیتیں موجود ہیں ان میں سے کچھ آیات ''اطاعت پر صبر'' سے متعلق ہیں۔

''اگر تم میں سے بیس شخص بھی صابر ہوں تو وہ دوسو لوگوں پر غالب ہوں گے اور اگر سو آدمی صابر ہوں تو ہزار آدمیوں پر۔۔''

اس آیت میں رکاوٹ بننے والے محرکات کا جو میدان جنگ میں مجاہد کو روکتے ہیں، مقابلہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور آیت میں یہ مفہوم بالکل واضح ہے۔

اس آیت میں جن صابروں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یہ وہ لوگ ہیں جنہیں نہ تلواروں کی چمک، نہ موت کا ڈر، نہ اعزاء و اقارب کی یاد اور نہ پرلطف زندگی کی آرزو، جہاد اور قتال سے روکتی ہے۔ خدا کی اطاعت کا فریضہ انجام دیتے ہوئے ان کے عزم وارادہ میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔

دوسری آیت ملاحظہ ہو۔

''اے پروردگار ہمیں صبر دے اور ہمارے قدم ثابت رکھ اور
ہمیں کافروں پر فتح عطا فرما''

قرآن میں ستر سے زائد مرتبہ صبر کے اشتقاقات استعمال ہوئے ہیں اور یہ الگ بحث ہے۔

اس آیت میں اس مومن جماعت کی بات ہو رہی ہے جو ایک فریضہ کے انجام دینے کے لئے میدان جنگ میں اترتی ہے اور خود کو دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کرتی ہے۔ یہ جماعت خدا سے ثابت قدمی اور ارادے کی مضبوطی کی طلب گار ہے تا کہ نتیجتاً وہ دشمن پر غالب آ سکیں۔ اس آیت میں بھی صبر کا مفہوم واضح اور ''طاعت پر صبر'' پر منطبق ہے۔

معصیت پر صبر:۔

انسان میں فطری طور پر ایسی خواہشات پائی جاتی ہیں جو اسے بعض کاموں کی طرف بلاتی ہیں اور بعض کاموں سے باز بھی رکھتی ہیں۔حقیقت میں یہ خواہشات انسان کے لئے عرصہ زندگی میں متحرک اور فعال رہنے کا ایک ذریعہ ہیں۔

ان خواہشات کو فطرت بھی کہتے ہیں۔جیسے خود پرستی، حب اولاد، حب مال، جنسی میلان اور ایسی بیسیوں کششیں جو فطرت کے اظہار کی علامت ہیں۔

اسلام انسانی فطرت اور خواہشات کے بارے میں کیا کہتا ہے اور ان کے مقابلے میں انسان کو کس قسم کا موقف اختیار کرنے کو لازمی قرار دیتا ہے۔کیا ان خواہشات کے آگے بلاچون وچرا سر جھکا دینا چاہئے۔ یا ان خواہشات کی سرکوبی کرنی چاہئے اور انہیں مشکل ریاضتوں سے بالکل ختم کر دینا چاہئے۔

یہ دونوں طریقے اسلامی نقطہ نظر سے صحیح نہیں ہیں۔

اسلام ایک طرف انسانی خواہشات کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ بلکہ اسے ناگزیر اور مفید واقعیت سمجھتا ہے اور دوسری طرف ان خواہشات کے طوفان کے آگے بند باندھتا ہے اور خواہشات میں کج روی کو موثر تدابیر اور حقیقت پسندانہ پیش بندیوں سے روکتا ہے۔

حقیقت میں جیسا کہ انسان فطرت اور خواہشات کا وجود زندگی کی بنیادی ضروریات پوری کرنے کا ذریعہ ہے۔اسی طرح خواہشات میں کج روی اور طوفان بھی کاروبار زندگی کو درہم برہم کر دیتا ہے۔

اگر حب نفس نہ ہوتو انسانی زندگی جاری نہیں رہ سکتی۔لیکن اسی خواہش میں بے موقع افراط انسان کے لئے زندگی کو دشوار بنا دیتا ہے۔ دیگر خواہشات کا بھی یہی حال ہے۔

معصیت میں صبر کا مطلب خواہشات کے طوفان کے سامنے ثابت قدم رہنا

ہے۔ کیونکہ بنیادی طور پر گناہ اور معصیت کا سرچشمہ خواہشات کی یہی کجی روی اور ان کا افراط ہے۔

فطری طور پر انسان یہ چاہتا ہے کہ اپنے وسائل زندگی اور بنیادی ضرورتوں کو پورا کرے اور چونکہ یہ کام مال ودولت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا کسب مال بھی ایک خواہش بن جاتی ہے۔

اسلام جو کہ مکتب انسانیت ہے وہ انسان کی بنیادی ضرورتوں کے لئے حل پیش کرتا ہے اور معاشرے کے صحیح نظام کے لئے شرائط وتجاویز نافذ کرتا ہے لیکن اسلام نے انسان کو بھی محنت اور کوشش سے نہیں روکا۔

اس کے باوجود اکثر مواقع پر یہ خواہش غیر متوازن ہو جاتی ہے اور حب مال اور دولت اندوزی موذی بیماری کی طرح انسان میں سرایت کر جاتی ہے۔ نتیجتاً اس شخص کے لئے دولت ضرورتیں پوری کرنے کا ذریعہ نہیں رہتی بلکہ غیر انسانی مقاصد کی تکمیل اور اظہار فخر ومباہات کا وسیلہ بن جاتی ہے۔ مسلمان کے لئے یہ چیزیں ممنوع ہیں۔ اسی لئے اسلام اپنے پیروکاروں کو صبر کا حکم دیتا ہے۔ یعنی اس خواہش کی کج روی اور طوفان کے سامنے ثابت قدم رہنے کا حکم۔

مال کی خواہش کا طوفان آدمی کو سودخوری، ذخیرہ اندوزی اور دوسروں کے مال پر ناجائز قبضے پر اکساتا ہے اور صبر یعنی شر انگیز محرک کے سامنے پائے استقلال میں لغزش نہ آنے دینا۔

اقتدار طلبی کی بھی یہی مثال ہے۔ انسان فطری طور پر چاہتا ہے کہ صاحب اقتدار ہو۔ جن لوگوں نے کمزوری اور تہدستی کو اپنے وجود کا حصہ سمجھ رکھا ہے انہیں یہ یقین کر لینا چاہئے کہ وہ اپنی انسانی فطرت سے منحرف ہو چکے ہیں۔

اسلام نے اقتدار طلبی کے معاملے میں بھی وہی رویہ اختیار کیا ہے جو وہ دوسری خواہشات کے بارے میں رکھتا ہے۔ یعنی ایک طرف تو وہ طاقت کو جائز اور مباح سمجھتا

ہے۔بعض حالات میں واجب اور لازم بھی قرار دیتا ہے۔یعنی قیام حق اور مستحق لوگوں کو ان کے تلف شدہ حقوق واپس دلانے اور احکام الٰہی نافذ کرنے کے لئے طاقت کی ضرورت ہے، اسلام نے طاقت طلبی کو سب پر ایک فریضے کی طرح واجب اور لازم قرار دیا ہے۔

لیکن دوسری طرف جارحیت اور توسیع پسندی کے لئے اس خواہش (طاقت پسندی) کو ممنوع قرار دیا ہے۔

ممکن ہے ایک ظالم طاقت اور مجرم حکومت کے ساتھ مل جانے سے اقتدار میں اضافہ ہو جائے لیکن اسلام ہرگز اس کی اجازت نہیں دیتا۔ کیونکہ ظالم کے ساتھ اتحاد کرنا ظلم کو پھیلانے میں مدد دینے کے مترادف ہے۔ظاہر ہے اس طریقے سے انسان کو جو اختیار اور اقتدار ملتا ہے اس سے وہ خود بھی ظلم کرے گا۔

یہاں اسلام اور قرآن ایسی خواہش کے طوفان کے آگے بند کی طرح نظر آتے ہیں اور مسلمانوں کو حکم دیتے ہیں کہ اقتدار طلبی کے اس شر انگیز محرک کے سامنے ثابت قدم رہیں اور اقتدار طلبی کی خواہش کے آگے سر تسلیم خم نہ کریں۔ یہی صبر عن المعصیہ یعنی گناہ پر صبر کرنا ہے۔

جنسی ملاپ، محبوب اور زندگی سے عشق کے جذبات کے بارے میں بھی غور کر کے اہم انفرادی اور اجتماعی مسائل کا پتہ چلایا جا سکتا ہے۔

معصیت پر صبر کی اہمیت:۔

مذکورہ وضاحت اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جو عموماً معاشرتی حقائق سے پر ہیں۔ایسا معلوم ہوتا کہ گناہ اور خواہشات کے طوفان کے آگے صبر کرنے کی بہت زیادہ اہمیت اور فضیلت ہے۔

آئمہ علیہم السلام کے افعال زمانے میں مسلمانوں کے لئے صادر ہونے والی ان مختصر مگر تعمیری روایات میں صبر کے پہلو پر زیادہ توجہ دی گئی ہے اور اس کی فضیلت

بیان کی گئی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ''صبر علی الطاعۃ'' کے راستے میں انسان کے ساتھ ایک قسم کا فطری شوق ہمسفر ہوتا ہے۔ یعنی حرکت اور کوشش کا شوق جب کہ ''صبر عن المعصیۃ'' میں انسان کا کام منحرف نہ ہونا اور رکاوٹوں کے آگے نہ جھکنا اور رکاوٹیں بھی ایسی جو انسان کی فطری کشش اور جاذبیت کے مطابق ہوں۔

''صبر عن المعصیۃ'' میں کوئی میلان، کوئی طبعی خواہش اس کی پشت پناہ نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ ہر ایسی خواہش کے بالکل برعکس واقع ہوتی ہے۔

پس پہلی حالت (صبر علی الطاعۃ) میں ایک طرف طبعی کشش یعنی آرام پسندی اور سہل انگاری کے سامنے صبر کیا جاتا ہے اور دوسری طرف اس کے ساتھ ساتھ ایک دوسری کشش لگی ہوئی ہے۔ جو اگرچہ کمزور ہے لیکن فطری ہے۔ لیکن دوسری قسم میں صبر طبیعی رجحانات اور نفسانی خواہشات سے یکسر مختلف اور معارض ہے۔ لہٰذا اس نوعیت کا صبر مشکل بھی ہے اور افضل بھی۔

دوسری طرف معصیت میں صبر کا کردار اجتماعی واقعات میں بھی زیادہ موثر اور واضح ہے اور یہ بھی اس فضیلت کی ایک دلیل ہوسکتی ہے۔

مثالیں:۔

اس قسم کے صبر کے بہت نمونے ہیں مثلاً کچھ طاقت ور لوگ مظلوموں پر اپنا تسلط قائم کرنے کے لئے قدم اٹھاتے ہیں اور ان کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں تو یہ بھی صبر کا ایک پہلو ہے۔ غصے کا محرک، تکبر، خودغرضی، مردم آزاری اور دوسرے کئی عوامل ہیں جو ان طاقتور لوگوں کو بے گناہوں پر ظلم کے لئے اکساتے ہیں۔ ایسے عوامل کے سامنے ثابت قدم رہنا اور کسی فرد پر اس جارحیت کو روکنا بھی صبر ہے۔

حب مال بھی ایسا محرک ہے جو انسان کو منحرف اور انتہا پسند بنا دیتا ہے اور انسان کو جرائم کی طرف مائل کرتا ہے۔

صبر یعنی اس محرک کے سامنے ثابت قدم رہنا اور گناہ کے ارتکاب سے حاصل

ہونے والے مفاد سے چشم پوشی کرنا اور اس گناہ کا ارتکاب نہ کرنا۔

جنسی کشش ایسے تمام رجحانات اور میلانات میں سب سے زیادہ قوی ہے۔ یہ ایسی دلدل ہے جس میں ہاتھی بھی دھنس جاتے ہیں۔ چنانچہ وقت کی یہ سحر آمیز کشش ان انسان دشمن لوگوں کا نہایت مناسب اور آسان ہتھیار رہی ہے جو ثابت قدم لوگوں کے پاؤں اکھاڑنا چاہتے ہیں۔ جن مواقع پر یہ کشش پست اور ناپاک بن جاتی ہے وہاں صبر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ اس مضبوط کشش کے جال میں نہیں پھنسے اور اس طریقے سے جو گناہ سرزد ہونا تھا اس سے بچ گئے۔

ڈر انسانوں میں پائی جانے والی ایک عام صفت ہے اور یہ صفت دوسری انسانی صفات اور خواہشات سے مل کر اسے جرائم پر آمادہ کرتی ہے اور رسوا کرتی ہے۔

کیونکہ اکثر کمزور انسانوں نے ڈر کے گونا گوں اثرات کی وجہ سے، جو ان کی جان، مال، منصب، آبرو اور اولاد پر ہو سکتے تھے، پست ترین جرائم کا ارتکاب کیا ہے اور اس صفت نے انہیں انسانیت کے اعلیٰ مقام سے گرا کر ''بے ارادہ مشین'' بنا دیا ہے۔

شر اور فساد کے اس محرک کے سامنے صبر کرنا بھی ''صبر علی المعصیۃ'' کی ایک دوسری مثال ہے۔

روایات پر ایک نظر:۔

اب اس پس منظر میں صبر کی زیر بحث قسم کے بارے میں آئمہ معصومین علیہم السلام کی روایات پر غور کیا جا سکتا ہے اور ان روایات سے سبق حاصل کیا جا سکتا ہے۔

پہلی روایت:۔

اصبغ بن نباتہ حضرت علی علیہ السلام کے دوستوں میں سے ہیں اور حضرت علی علیہ السلام کے صبر کے بارے میں روایت کا یوں تجزیہ کرتے ہیں۔

صبر دو قسم کا ہے:

''ایک مصائب پر صبر کرنا جو بہت احسن ہے۔لیکن اس سے احسن تر صبر خدا کے حرام کردہ اور ممنوع کاموں پر صبر کرنا ہے'' [1]

دوسری روایت:

امام جعفر صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت نقل کی ہے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلامی امت کے مستقبل کے بارے میں یوں خبر دی۔

''امت اسلام پر ایک ایسا زمانہ آئے گا جب عوام پر تسلط اور اقتدار صرف قتل اور جبر کے ذریعے ہی حاصل ہوسکتا ہے۔''

''دولت مظلوموں اور کمزوروں کا مال غصب کئے اور محروموں کے مالی حقوق میں بخل برتے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی''

یعنی مسلمان معاشرے کا فطری کردار ایسا نہیں ہوگا کہ کسی پر ستم ہوئے بغیر سب لوگ دولت مند ہو جائیں۔ بلکہ ایک خاص گروہ کا دولت مند ہونا دوسرے گروہ پر ستم ہونے اور اسے محروم رکھنے کے ساتھ ساتھ ہے اور یہ مسلمان معاشرے میں طبقاتی نظام پیدا ہونے کی کھلی پیش گوئی ہے۔

''مقبولیت حاصل کرنا اپنی زندگی سے روح دین کو خارج کئے بغیر اور نفسانی خواہشات کے آگے سر جھکائے بغیر ممکن نہیں ہے۔''

یعنی صرف چاپلوسی، جھوٹ، ریاکاری، چال بازی، ہواوہوس کی پیروی، لوگوں کو دھوکہ دینے، ببانگ دہل بیان کئے جانے والے عیوب کو چھپانے، حقائق کو مسخ کرنے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو نظر انداز کرنے ہی سے عوام الناس میں مقبولیت یا فاسد رہنماؤں کی توجہ حاصل کی جاسکتی ہے۔

---

[1] اصول کافی جلد ۲ صفحہ ۹۰

اگر کوئی شخص اپنی اسلامی ذمہ داریوں پر کار بند ہو اور چاپلوسی اور جھوٹ سے کام نہ لے اور نقائص اور برائیوں کا عوامی حلقوں اور مقتدر طبقوں میں برملا اظہار کرے۔ حقائق بیان کرے اور عوام الناس کو جھوٹے وعدوں سے نہ بہلائے اور اپنی کسمپرسی پر اسے خوش فہمی نہ ہو۔ تلخ باتوں سے جو کہ عوام کے لئے ناخوشانید اور طاقتوروں کے لئے جگر شگاف خنجر ہوتی ہے۔ برائیوں سے پردہ چاک کرے تو وہ نظروں سے گر جاتا ہے اور محبتوں سے محروم ہو جاتا ہے۔

یہ پر مغز جملہ لوگوں کی فکری سطح کے نیچے آ جانے اور مسلمانوں کی زندگی میں غلط اور انحرافی واقعات پیدا ہونے کی طرف واضح اشارہ ہے اور یہ بات پوری طرح ظاہر ہے کہ عوامی زندگی جس کا نظام شروع شروع میں خالص اقتدار کی بنیاد پر مرتب کیا گیا ہے اور معاشرہ اسلامی طرز اور تفکر پر چل نکلا۔ تو اس میں مذکورہ حالات کا پیدا ہونا صرف طاقتوروں اور ناہنجاروں کی سازشوں اور کوششوں ہی سے ممکن ہے۔

لہٰذا اس جملے کو بھی ہم اسلامی تاریخ میں غاصبانہ سیاسی اور غیر انسانی واقعات کے بارے میں ایک کھلی پیش گوئی کہہ سکتے ہیں۔ ایسے نظام اور برے حالات میں لوگوں کی ذمہ داری کیا ہے۔

مذکورہ روایت میں اس کا جواب دیا گیا ہے اور اس جواب سے صبر کا صحیح مفہوم واضح ہوتا ہے۔

> ''جو شخص ایسا زمانہ پائے (یعنی جو نقشہ اوپر کھینچا گیا ہے) تو غربت اور تنگدستی پر صبر کرے حب مال کے محرک کے سامنے ثابت قدم رہے''۔

جن حالات میں وہ مروجہ ہتھکنڈوں سے خود کو دولت مند بنا سکتا ہے۔ ان میں اپنے آپ پر قابو رکھے۔ یعنی وہ ناپاکیاں قبول کر کے، جرائم اختیار کر کے، اپنی عزت و آبرو خاک میں ملا کر اصولوں کو پامال کر کے اپنے لئے خوشحال زندگی کے لئے راستہ ہموار

کر سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔

صبر یعنی اس دولت سے صرف نظر کرنا جو دوسرے ہزاروں انسانوں کو غریب بنا کر جمع کی جاتی ہے۔ اس نرم و گرم اور لذیذ غذا کو ہاتھ نہ لگانا جو بے شمار لوگوں کو بھوکا رکھ کر حاصل کی جاتی ہے۔

صبر یعنی نادان لوگوں اور خود غرض لیڈروں کی چاپلوسی اور جھوٹ کے ذریعے خوشنودی حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوئے بھی ایسا نہ کرنا۔

''معاشرے کے نچلے درجوں پر صبر کرے۔ محرومی کے ساتھ اپنا مقام و منصب پیدا کرے۔ لیکن اگر اس مقصد کے لئے اسے جرائم کرنا پڑیں تو خود کو ان سے آلودہ نہ کرے۔ خدا ایسے شخص کو پچاس صدقوں کے برابر ثواب دے گا۔''

مذکورہ روایت سے ''صبر بن المعصیة'' کی اہمیت اور فضیلت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔

مصیبت کے وقت صبر:

انسانی زندگی ہمیشہ ناگوار حادثات وواقعات کی زد میں ہے اور اس سے مفر نہیں ہے۔

انسانی ساخت کی کیفیت نے اس پر یہ حالت مسلط کی ہے اور مصائب وبلیات کو اس کی زندگی کا دائمی حصہ بنا دیا ہے۔

حضرت مولائے متقیانؑ سے منسوب یہ مشہور جملہ

''دنیا آزمائشوں اور مصیبتوں سے گھرا ہوا گھر ہے''

اسی حقیقت کا ترجمان ہے۔

بیماریاں، جسمانی تکالیف، مالی نقصانات، عزیزوں کی اموات، محرومیاں غرض انسانی زندگی میں قسم قسم کی تکالیف ہیں۔ جن سے فرار حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ حتیٰ کہ تاریخ کے عظیم ترین لوگ بھی اس قسم کے حادثات سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔

لوگوں کا ردعمل دوطرح کا ہوتا ہے۔بعض لوگ مصیبت کے وقت استقامت کو ہاتھ سے کھو دیتے ہیں اور شکستہ دل ہوکر بیٹھ جاتے ہیں۔بعض لوگ مصیبت کا بوجھ برداشت کر لیتے ہیں اور اسے دنیا کا ایک طبیعی واقعہ سمجھ کر خود کو مصیبت کے اثرات سے بچا لیتے ہیں۔

مشہور شاعروں کے بقول

''انسان کی عظمت، فضیلت اور قیادت کا امتحان مصیبت کے وقت ہی ہوتا ہے۔'' رونا دھونا جو کہ کمزور، چھوٹے دل والوں اور کم ظرف لوگوں کا شیوہ ہے بجائے خود ایک طبیعی کشش ہے۔ایسی تکلیف ہے جو سرکش جذبے کے شور کو انسان پر مسلط کرتی ہے اور انسان کے ہر عضو پر اثر انداز ہوتی ہے۔آنکھ کو رلاتی ہے، زبان کو شکایت کے لئے کھلواتی ہے۔حلق کو دھاڑیں مارنے کے لئے مجبور کرتی ہے، ہاتھ پاؤں اور سر کو بھی مخصوص حرکات کے لئے اکساتی ہے۔

مصائب پر صبر کرنے کا مطلب ہے جذبات کی ان لہروں کے آگے ثابت قدم رہنا۔

صابر انسان اس قسم کے مصائب پر اپنی روحانی متانت اور انسانی شخصیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا اور نہ ہی حادثات پر حواس باختہ ہو جاتا ہے۔مصیبت اسے مردہ دل، افسردہ اور بے کیف نہیں بناتی۔

صبر کی یہ قسم بھی صبر کی پسندیدہ اقسام میں سے ایک ہے۔جیسا کہ حدیث میں اسے ''حسن جمیل'' کہا گیا ہے۔

انسان جو ایک مقصد کی طرف گامزن ہے اور ایک خاص منزل کی طرف جادہ پیما ہے۔اگر وہ ہر ناگوار حادثے پر متاثر ہونے لگے اور کسی قدر اپنی روحانی خوشی کھونا شروع کر دے تو اس سے یہ توقع نہیں رکھی جاسکتی کہ وہ اس روحانی پختگی کی حفاظت کر سکے جو راستے طے کرنے کے لئے ضروری ہوتی ہے۔

ان محرکات پر ثابت قدم رہنا جو انسان کو ان مصائب کے سامنے ناصبری پر مجبور کرتے ہیں۔ وہ عامل ہے جو انسان میں اس کی روحانی خوشی کی حفاظت کرتا ہے اور اس کو ضائع ہونے سے بچاتا ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ ثابت قدمی انسان میں آہنی عزم اور ارادے کی قوت کو مضبوط کرنے کے لئے ایک مشکل مگر مفید مشق ہے۔ وہی ارادہ جس کے بغیر مشکلات کو جھیلنا جو کہ ہر ایک کی ذمہ داری ہے، کسی طرح عملی نہیں ہے۔

پس ان مصائب و مشکلات پر صبر کرنا جو خود بخود اور بغیر اختیار کے انسان پر آپڑتی ہیں دو نہایت اہم فوائد کا حامل ہے۔

۱۔ یہ صبر روحانی مسرت کو جو کہ تمام سرگرمیوں کا خمیر ہے، پیدا کرتا ہے، اس کی حفاظت کرتا ہے۔ اسے ختم ہونے یا ضائع ہونے سے بچاتا ہے۔

۲۔ انسانی ارادے کو جو کہ اس کے عمل کا محرک ہوتا ہے، مضبوط بناتا ہے اور انسان کو اختیاری مصائب (جن پر ہم آگے چل کر بحث کریں گے) کا سامنا کرنے کا حوصلہ بخشتا ہے۔

اکابر اسلام نے مصائب پر صبر کرنے کے بارے میں جو شوق اور رغبت دلائی ہے۔ اس کے اثرات معجزے سے کم نہیں۔

مندرجہ ذیل دو روایات میں اس گہرے فلسفے کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

''جو شخص زمانے کی سختیوں پر صبر نہیں کرے گا۔ وہ عاجز اور درماندہ ہو کر رہ جائے گا''۔ [1]

''بندے کے لئے وہ مقام اور رتبہ رکھا گیا ہے جس تک وہ عمل کے ذریعے نہیں پہنچ سکتا۔ پس خدا اسے جسمانی تکلیف، مالی خسارے یا اولاد پر مصیبت کے امتحان میں

---

[1] کافی۔ جلد دوم۔ ص ۹۳

ڈال دیتا ہے۔ اگر اس نے صبر کیا تو خدا اسے اس مقام پر پہنچائے گا''[1]۔

مئوخر الذکر روایت میں صبر کا تعمیری کردار بالکل واضح ہے۔

عثمان بن مظعون صدر اسلام کے ممتاز مسلمان اور حبشہ اور مدینہ کو ہجرت کرنے والے اصحاب میں شامل تھے۔ مدینہ میں ان کا جوان بیٹا فوت ہو گیا۔ اس المیے سے ان پر غم کا ایسا پہاڑ ٹوٹا کہ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب باقی ماندہ عمر وہ گوشہ نشین ہو کر عبادت میں گزار دیں گے اور سماجی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لیں گے۔ اس المیے میں ان کی افسردگی کی یہ حالت تھی کہ انہوں نے زندگی کی رنگینیاں نہ دیکھنے کو ترجیح دی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے پاس آئے اور انہیں اس عمل سے منع فرمایا اور کہا۔

''اسلام میں گوشہ نشینی، ترک دنیا اور انفرادی عبادتوں میں عمر گزارنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ میری امت میں رہبانیت اور ترک دنیا خدا کے راستے میں جہاد کی صورت میں انجام پانا چاہئے۔''[2]

پس غیر اختیاری مصائب پر صبر کرنے کا مطلب ہے۔ مصیبت کا بوجھ برداشت کرنا، زندگی کی مسرت کو نہ کھونا اور زندگی کی حقیقی سرگرمیوں کو جاری رکھ کر اس مصیبت کے ناگوار اثر کو فراموش کرنا۔

اختیاری مصائب پر صبر

اس صبر کی بہترین مثال وہ ہے کہ با مقصد انسان اپنے عمل و شعور سمیت اپنے مقصد کی طرف گامزن رہے اور اس راستے میں فی الواقع جو مشکلات موجود ہیں ان پر صبر کرے اور راستے کی ناہمواریوں اور سختیوں سے دوچار ہو کر آگے بڑھنے سے رک نہ جائے بلکہ اپنا سفر جاری رکھے۔

تاریخ کے معاشرتی حالات کا گہرا مطالعہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ ہمیشہ انسان

---

[1] سفینۃ البحار۔ ج ۲ ص ۵

[2] سفینۃ البحار۔ جلد الفظ رھب

کے اعلیٰ مقاصد جن میں خدا کے انبیاء کے مقاصد سرفہرست ہیں۔ ظالم اور مفاد پرست طبقات کے مفاد کے ساتھ تصادم اور تضاد کی وجہ سے ان طبقات کے لئے قابل اعتراض اور قابل مخالف رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان مقاصد کے علم برداروں اور مذکورہ طبقہ کے کرتا دھرتا لوگوں کے درمیان دائمی کشمکش اور جنگ رہی ہے۔

قرآن مجید کی متعدد آیات میں جہاں انبیاء کے مقابلے میں کھاتے پیتے لوگوں اور طاغوتوں کا ذکر ہوا ہے۔ اس علمی واقعیت کی ترجمانی کی گئی ہے۔

یہ حالت جس سے مفر نہیں اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ راہِ حق کے مسافروں اور عدل و انصاف کے منادیوں اور انبیاء کے پیروکاروں کے لئے ہر قسم کی مشکلات اور آفات کی پیش گوئی کی جائے۔ چنانچہ قرآن کریم میں اس راستے کی خطرات پہلے ہی واضح کر دیئے گئے ہیں تاکہ مومنین مشکلات سے نمٹنے کے لئے تیار رہیں اور وہ تاریخ میں پیش آنے والی اس حقیقت سے باخبر رہیں۔

> ''بے شک تمہارے مال اور جان میں تمہاری آزمائش کی جائے گی اور تم یہود و نصاریٰ اور مشرکوں کی طرف سے بہت ایذا پاؤ گے۔ تو اگر صبر اور پرہیز گاری کرتے رہو گے تو یہ بڑی ہمت کے کام ہیں۔'' [1]

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جو لوگ خدا کا بندہ اور مومن بن کر رہنا چاہتے ہیں اور خدا کے احکام و فرائض پر پابند ہونا چاہتے تھے۔ انہیں مخالفین کی طرف سے ایذاؤں اور تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اور انہوں نے اپنے بارے میں قرآن کی پیش گوئی سچی پائی۔

البتہ اس مقصد کی تلاش میں جس کے قدم اور ایمان زیادہ مضبوط ہیں اور وہ زیادہ اہمیت کا حامل ہے اور اس کے عمل کے اثرات وسیع پیمانے پر متوقع ہیں تو اسی پر صدموں اور تکلیفوں کا زیادہ بوجھ بھی پڑے گا۔ جسے اٹھانا مزید مشکل کام ہے۔

---

[1] سورۃ آل عمران:۱۸۶

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ایک حدیث میں اس بات کی وضاحت کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

''سب سے زیادہ آزمائش پیغمبروں کی ہوتی ہے پھران لوگوں کی جوان سے قریب تر ہیں جوان کی مثل ہوگا۔ وہ اسی قدر ابتلا میں ہوگا۔''[1]

تاہم یہ حوادث پہلی قسم کے ناگوار واقعات کی طرح نہیں ہیں کہ انسان کو ہر حال میں ان سے دوچار ہونے کے سوا چارہ نہ ہو بلکہ ہر شخص کے اختیار میں ہے کہ وہ آسودہ زندگی کو ترجیح دے کر ان حادثات کے اثرات سے محفوظ رہ سکے۔

ان آفات وبلیات سے بچاؤ اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ انسان اپنے مقصد کے تعاقب میں رہے۔

ہر وہ عافیت پسند خانہ نشین شخص جو ترجیح دیتا ہے کہ اپنے گھر سے باہر قدم نہ رکھے اور اپنے لئے سفر کی تکلیف کا دروازہ نہ کھولے۔ اور سیر وسیاحت سے حاصل ہونے والے تمام فوائد سے چشم پوشی کرے وہ اپنی تمام عمر میں خود کو ناگہانی حادثات مثلاً پہاڑ سے لڑھکنا، درندوں سے واسطہ پڑنا۔ راہزنوں کے ڈر اور دھمکاؤ اور دوسرے سینکڑوں حادثات جو خاص طور پر سفر کے دوران پیش آسکتے ہیں اسے بچا سکتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ہر غیر ذمہ دار اور کوئی رائے نہ رکھنے والا شخص زندگی کے مقصد کو نہ پہچان کر اس کے حصول کے لئے قدم نہ اٹھائے اور ایک غیر متحرک زندگی کو پسند کر لے۔ سعدی کے فتویٰ

به دریا درمنافع بیشمار است
وگرخواہی سلامت درکنار است

پر عمل کرے، بے شک اس طرح وہ ان تمام حادثات اور بلیات اور مصائب سے بچ سکتا ہے جو انبیاء کے راستے میں لازمی طور پر پیش آتے ہیں۔

---

[1] سفینۃ البحار۔ لفظ ''بلا''

پس انبیاء کے راستے کے حادثات اور بلیات مذکورہ مفہوم میں ''اختیاری'' بلیات اور مصائب ہیں اور صرف وہی لوگ ان میں مبتلا ہوتے ہیں جنہوں نے امیر المومنین علیہ السلام کے حکم ''راہ حق میں بلا کے گرداب میں قدم رکھ اور اس میں پھنس جا۔'' کی پیروی میں رہ حق میں قدم رکھا، اور خدا کے انبیاء کی دعوت کو حق اور سچ مانا۔

یہ صبر مصیبت قبول کرنے اور اس مفہوم میں ہے کہ ان تمام محرکات کے سامنے ثابت قدم رہے جو اسے آدھے راستے واپس مڑنے اور اس قسم کے مصائب کے سامنے تسلیم ہو جانے پر اکساتے ہیں اور اگر وہ مصائب سے دو چار ہو جائے تو پشیمان نہ ہو۔

خباب بن الارث ایثار پیشہ مسلمان اور ان لوگوں میں شامل ہیں جنہوں نے پہلے پہل اسلام قبول کیا۔ ایمان کے جرم میں وہ اپنے اثاثے کی خاصی مقدار سے محروم ہو گئے۔ ایک دن شدید دباؤ میں تھے کہ حضرت رسول اکرمؐ کے پاس شکایت لے کر گئے۔ خود صحابی بیان کرتے ہیں کہ

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی چادر کو تکیہ بنا کر خانہ کعبہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ جب میری بات سنی تو اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ان کے چہرے کا رنگ متغیر ہو چکا تھا۔ کہا: تمہارے اسلاف کو لوہے کے آرے کے نیچے اس طرح ڈالتے تھے کہ آرہ ان کا گوشت و پوست اور لوگوں کو ہڈیوں تک چیرتا چلا جاتا تھا۔ لیکن دین سے برگشتہ نہیں ہوتے تھے بعض دفعہ تو آرے سے ان کے دو ٹکڑے کر دیئے جاتے۔ خدا اس کام کو اختتام تک پہنچائے گا۔ یہاں تک کہ وہ ''صنعا'' سے ''حضر موت'' تک ایک سوار چلائے گا اور اسلامی حکومت اور نظام اسلام کے نفاذ کے نیچے میں راستے ایسے پر امن ہو جائیں گے کہ خود آدمی خدا کے علاوہ کسی سے اور اس کی بھیڑوں کا گلہ بھیڑیے کے علاوہ کسی سے نہ ڈرے گا۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس قسم کے پر جوش ارشادات سے اپنے پیروکاروں میں روحانی استحکام اور آہنی عزم کو مزید مستحکم کیا کرتے تھے۔ اور مومن بننے کے بعد جو

مصائب پیش آتے ہیں۔ان پر صبر واستقامت کرنے کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔

ممکن ہے کوئی شخص اسلامی احکام انجام دینے پر صبر (صبر علی الطاعۃ) یا گناہ کے محرکات پر صبر (صبر عن المعصیۃ) کرنے کے نتیجہ میں مومنین کی صف میں شامل ہو جائے اور اس راستے پر قدم رکھے جو خدا تک پہنچاتا ہے۔لیکن ان مصائب اور حوادث کو برداشت نہ کر سکے جو اس راستے کا لازمی حصہ ہیں اور وہ شخص بے صبری سے راستہ ادھورا چھوڑ کر واپس چلا جائے اور اپنی باقی ماندہ ذمہ داریوں کا بوجھ اتار پھینکے۔پس اس سفر کی تکمیل اسی صورت میں ہوسکتی ہے۔جب انسان اختیاری مشکلات پر صبر اختیار کرے۔

اختیاری مصائب پر صبر کی تلقین کی راہیں:۔

اسی اہمیت اور بنیادی کردار کی وجہ سے قرآن کریم کی کئی آیات میں اس نکتے پر بہت زور دیا گیا ہے اور مختلف الفاظ اور اسالیب کے ذریعے اسلام کے پیروکاروں کے دل وجان میں اس استقامت کا خمیر تیار کیا گیا ہے۔

اختیاری مصائب پر صبر پیدا کرنے کا ایک طریقہ غیر اختیاری مصائب کو پیش کرنا ہے۔قرآن مجید میں اس لئے کہ فرض کی تکمیل کے راستے میں موت کا پیش آنا راہروان حق کو دشوار نہ لگے۔انہیں (راہروان حق کو) یاد دلایا گیا ہے کہ

> ''موت عالم بشریت کے ہر فرد کی تقدیر ہے۔جو لوگ میدان جنگ میں نہ مریں، وہ آخر کار بستر پر اور گھروں میں مر کر رہیں گے۔موت اور زندگی خدا کے ہاتھ میں ہے۔لیکن جو موت خدا کے لئے ہو اور راہ حق میں ایک عمل شمار کی جائے۔اس پر اجر اور انعام ملے گا۔'' [1]۔

قرآن کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ان مصائب کہ قبول کرنے پر جو پیش رفت

---

[1] ماخوذ از سورہ آل عمران آیت ۱۴۴، ۱۵۶:۱۵۸

حاصل ہوتی ہے وہ اسے یاد دلاتا ہے۔

سورہ آل عمران کی ۱۳۹ اور ۱۴۰ آیات میں یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔

''بے دل نہ ہونا اور نہ کسی کا غم کرنا اگر تم مومن ہو تو تم ہی غالب رہو گے۔ اگر تمہیں زخم لگا ہے تو ان لوگوں کو بھی ایسا زخم لگ چکا ہو''

ایک اور طریقہ یہ ہے کہ قرآن سابقہ لوگوں کی سرگذشت اور ان کی جدو جہد اور صبر وشکیبائی یاد دلاتا ہے جو وہ اختیاری مصائب پر کرتے تھے۔

سورہ ال عمران کی آیت ۱۴۶ میں پیغمبر کے دوستوں اور اسلام کے علمبرداروں کو اس طرح صبر سکھایا گیا ہے۔

''بہت سے نبی ہوئے ہیں جن کے ساتھ ہو کر اکثر اہل اللہ (خدا کے دشمنوں سے) لڑے ہیں۔ تو جو مصیبتیں ان پر راہ خدا میں واقع ہوئیں۔ ان کے سبب انہوں نے نہ تو ہمت ہاری اور نہ بزدلی کی۔ نہ (کافروں سے) دبے اور خدا استقلال رکھنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔''

قرآن کی دیگر متعدد آیات بھی اس قسم کے حقائق کی ترجمان ہیں اور انبیاء کے راستے پر چلنے والوں کے شوق کو مہمیز لگاتی ہے۔

اگر چہ اس قسم کے مصائب پر صبر کرنا اپنی جگہ بہت مشکل ہے اور قوی ارادہ اور راسخ ایمان چاہتا ہے لیکن یہی صبر قوی ارادہ اور راسخ ایمان پیدا کرنے اور اس سے بڑھ کر اسلام کی سماجی بہشت قائم کرنے میں معجزانہ کردار ادا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کی آیات اور آئمہ ہدی علیہم السلام کی روایات میں صبر کی اس قسم کے بارے میں طرح طرح کے احکام صادر ہوئے ہیں۔ ہم یہاں صرف ایک روایت پر اکتفا کرتے ہیں جو ہر قسم کی مصیبت پر صبر کرنے کے بارے میں ہے۔

''آزاد ہر حال میں آزاد ہے اگر اس پر کوئی حادثہ گزرے تو وہ اس پر صبر کرتا

ہے۔ اگر اس پر ہر طرف سے مصیبتیں اور آزمائشیں آ پڑیں اور اس پر سخت چوٹ لگائیں تو بھی وہ اسے نہیں توڑ سکتیں۔ خواہ وہ قیدی بنا لیا جائے اور زمانے کی قدرتوں کا اس پر قہر نازل ہو اور اس کی آسائش اور راحت سختی اور بے آرامی میں بدل جائے جیسا کہ راست گو راست باز یوسف تھے۔ قید، مغلوبیت اور غلامی بھی ان کی آزادی کو ختم نہ کر سکی۔'' [1]

وسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

---

[1] اصول کافی جلد دوم ص ۸۹